شائع کردہ

مولانا محمد علی جوہر صدی کمیٹی علی گڑھ

Scanned by CamScanner

آزادی

یا

موت

مولانا محمد علی جوہر

[مولانا محمد علی جوہر کی آخری تقریر جو انھوں نے

گول میز کانفرنس کے چوتھے اجلاس میں ۱۹ نومبر

۱۹۳۰ء کو قصر سینٹ جیمس لندن میں کی]

شائع کردہ

مولانا محمد علی جوہر صدی کمیٹی

علی گڑھ

Scanned by CamScanner

سلسلہ مطبوعات صدی کمیٹی - ۱

قیمت ایک روپیہ

طباعت
مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ

Scanned by CamScanner

پیش لفظ

آسمانِ سیاست کے انجم درخشندہ، میدانِ صحافت کے شہسوار، وطنِ عزیز کی جنگِ آزادی کے نڈر سپاہی اور خطیب آتش نوا مولانا محمد علی جوہر کی ان کی حیات میں خاطر خواہ قدر نہ ہوئی۔ ان کی وفات کے بعد ملک نے ان کو بالکل ہی بھلا دیا حالانکہ جد و جہد آزادی میں ان کی خدمات اور قربانیاں کسی بھی دوسرے محبِ وطن سے کم نہیں تھیں۔

دسمبر ۱۹۷۸ء میں ان کی ولادت پر ایک صدی گزر جائے گی۔ اسی لیے "مولانا محمد علی جوہر صدی کمیٹی" نے ۱۹۷۸ء میں ان کی شایانِ شان یادگار منانے کا فیصلہ کیا ہے۔ دیگر تقاریب کے علاوہ اس دوران اہلِ وطن کی یادداشت کو تازہ کرنے کے لیے، مولانا کے خیالات سے نئی نسل کو روشناس کرانے کے لیے ان کی تقریروں اور تحریروں کی از سرِ نو اشاعت کا منصوبہ بھی بنایا گیا ہے۔

اس سلسلے کی پہلی کڑی اس تقریر کا ترجمہ ہے جو ۱۹ر نومبر ۱۹۳۰ء کو مولانا مرحوم نے گول میز کانفرنس میں کی تھی اور جس کی گونج سے قصرِ سینٹ جیمس کے در و دیوار لرز اٹھے تھے۔ آج اس کو پورے ۴۷ سال گزر چکے ہیں، آزادی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو چکا ہے، لیکن آج بھی اس تقریر کی اثر آفرینی کم نہیں ہوئی۔

اردو ترجمے کے لیے کمیٹی جناب م م صدیقی صاحب کی شکر گزار ہے۔

عتیق احمد صدیقی

معتمد اعزازی

مولانا محمد علی جوہر صدی کمیٹی

علی گڑھ

۱۹ر نومبر ۱۹۷۷ء

آزادی یا موت

مولانا محمد علی کی آخری تقریر جو انھوں نے گول میز کانفرنس کے چوتھے عام اجلاس میں چہار شنبہ ۱۹ نومبر ۱۹۳۰ء کو قصر سینٹ جیمس لندن میں کی

جناب صدر ___ اپنی شدید علالت کے پیش نظر میں آپ سے بیٹھ کر تقریر کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

میرے دوست ڈاکٹر مونجے یہ بتا چکے ہیں کہ کس طرح ان پر اپنے ملک سے غدّاری کرنے کا الزام لگایا گیا ہے۔ میرے خیال میں اِس جگہ ہم دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ جیسا کہ اُن کو خوب معلوم ہے جس دن ہم دونوں ہندوستان سے روانہ ہو رہے تھے اس دن ہمکو خداحافظ کہنے کے لئے سیاہ جھنڈے لہرائے جانے والے تھے اور جن لوگوں کے ساتھ ہم نے برسوں کام کیا تھا اُن کی خواہش تھی کہ ہمارا جہاز "وائسرائے آف انڈیا" سمندر کے تھپیڑوں کی نذر ہو جائے۔ جب میں اس ملک میں پہونچا تو یہاں کے اخبار "ڈیلی ہیرالڈ" نے جس کی مالی حالت کو مستحکم بنانے میں میں نے مدد کی تھی اور جس کے متعلق مجھے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ اس کی اشاعت دس لاکھ ہے، میری تصویر شائع کی اور یہ لکھا کہ میں نے اپنا عقیدہ بدل دیا ہے۔ شاید اس کا یہ مطلب ہے کہ وطن دوستی کو خیرباد کہہ کر میں اب ملک سے غدّاری پر اُتر آیا ہوں۔

Scanned by CamScanner

دارالامرا کے ان ممبر کے علاوہ جنھوں نے کل اس کانفرنس میں نہایت صاف گوئی اور خلوص کے ساتھ تقریر کی تھی پارلیمنٹ میں ایک اور قدامت پرست بزرگ سر جان کس ادمن ہیں جو آکسفورڈ میں میرے استاد رہ چکے ہیں۔ اس وقت میں انھیں کی لکھی ہوئی تاریخ کے ایک مختصر سے جملے کا حوالہ دوں گا جو انڈین سول سروس کے امتحان میں جس میں میں بھی شریک ہوا تھا مگر ناکام رہا، ایک سوال کا موضوع تھا۔ وہ جملہ یہ تھا کہ "صرف سامی (عربی مسلمان) ہی ایسا انسان ہے جس کے عقیدوں کو بدلنا ناممکن ہے"۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ اس مجلس کے سفید فام ارکان اور ڈاکٹر مونجے کی طرح میری رگوں میں آریائی خون ہے۔ البتہ مجھ میں وہ خون ہے جو شاید لارڈ ریڈنگ کی، جو مجھے قید میں رکھ چکے ہیں، رگوں میں دوڑتا ہے۔ میں نسلاً سامی ہوں اور اگر لارڈ ریڈنگ نے اپنا عقیدۂ صیہونیت نہیں تبدیل کیا ہے تو میں بھی اسلام سے منحرف نہیں ہوا ہوں اور اپنے عقائد پختگی سے قائم ہوں۔ میں اپنی پارٹی کا تنہا شخص ہوں جس کو وائسرائے، یا حکومت برطانیہ، یا کسی اور نے جس نے ان عجیب و غریب نمائندوں کا تقرر کیا ہے، انتخاب کیا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ ہم کس کے نمائندے ہیں۔ میں کسی کا نمائندہ ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا لیکن آئندہ دکھوں گا، اور اگر آپ میری تقریر کو صبر کے ساتھ سنیں گے تو آپ بھی مجھ سے اتفاق کریں گے کہ میں خود اپنی غلط نمائندگی نہیں کر رہا ہوں اور میرا خیال ہے کہ میرے لئے اتنا ہی بہت ہے۔ سیاست میں اکثر اپنے کو بھی بہت رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

لارڈ پیل کے جواب میں میں ایک انگریزی شاعر کا مقولہ پیش کروں گا جیسا کہ میں نے اس وقت کیا تھا جب ہم دونوں لابی سے گزر رہے تھے۔ میں نے کہا تھا کہ "میں امید کرتا ہوں کہ جناب والا قدامت پسند ہیں اور اپنی قدامت پسندی پر قائم رہیں گے کیونکہ قدامت پسند کی تعریف جو مجھ کو صرف ٹینی سن کے کلام میں ملی ہے وہ یہ ہے کہ "بہترین قدامت پسند وہ شخص ہے جو خشک شاخ کو کاٹ کر پھینک دے"۔ میں سمجھتا ہوں کہ جن خیالات کا اظہار لارڈ پیل نے نہایت خلوص اور صاف گوئی سے کیا

ہے وہ اسی خشک شاخ کی طرح ہیں جس کو کاٹ کر پھینک دینا چاہئے۔ میرا اُن کو یہی جواب ہے۔ دوسرے قدامت پسند، مہاراجہ صاحب ریوا، خود ہمارے ہاں کے ایک والیِ ریاست ہیں، مگر اُن کی قدامت پسندی کے متعلق مجھے شبہ ہے۔ اگر وہ برک کو قدامت پسند سمجھتے ہیں، اور اسی وجہ سے اپنی تقریر کے آخر میں اُن کا حوالہ دیتے ہیں تو میں یہ کہوں گا کہ قدامت پسند بنئے اور اس پر قائم رہئے کیونکہ 'برک' کے حوالہ سے ہز ہائنس نے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ "کم ظرف انسانوں اور عظیم الشان سلطنتوں کا جوڑ نہیں ہو سکتا" اگر برطانوی شہنشاہیت (مجھے اس سے غرض نہیں ہے کہ آپ اسکو شہنشاہیت کہئے یا دولت مشترکہ اقوام) یہ چاہتی ہے کہ اس کی عظمت برقرار رہے تو اُن کم ظرف انسانوں کو جو اتنے طویل عرصہ تک ہمکو چلتے پھرتے نظر آتے رہے ہیں نا پید ہو جانا چاہئے۔ اگر آپ نے برک کے کہنے پر عمل کیا ہوتا تو نہ تو امریکہ آپ کے ہاتھ سے جاتا اور نہ آپ کو یہ کہنے کی ضرورت پڑتی کہ جنگی جہازوں کے بنانے میں عددی توازن قائم رکھا جائے۔ بلکہ اس کے بجائے گفتگو انسانی ہمدردی کی ہوتی آپکو اتنے گراں بار قرضوں کی ادائیگی کی فکر بھی نہ ہوتی اور نہ تخفیف اسلحہ کانفرنس کے انعقاد کی تیاری کے لیے جو کمیشن مقرر ہوا ہے اس میں شرکت کی غرض سے بار بار جینوا جانا پڑتا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ تیاری کب تک ہوتی رہے گی۔ یہ سب اس بات کا نتیجہ ہے کہ آپ اپنے سب سے بڑے سیاست دان، اپنے سب سے بڑے مُدبّر کو بھول گئے جس کا نام آپنے دارالعوام میں "کھانے کی گھنٹی" رکھ چھوڑا تھا کیونکہ جب بھی وہ تقریر کرنے کھڑا ہوتا تھا تو آپ سب اٹھ کر کھانے کے کمرے میں چلے جاتے تھے۔ آپ برک کے ایسے آدمیوں سے اب بھی وہی سلوک کرتے ہیں اس لئے میں پھر اسی کے حوالہ سے کہتا ہوں کہ "تدابیر کی نہیں بلکہ انسانوں کی ضرورت ہے" مجھے اس کی فکر نہیں ہے کہ آپ ہمارے لئے کیسا دستور بناتے ہیں لیکن اگر انگلستان میں ایک آدمی بھی ایسا ہے جو حقیقت میں انسان ہے تو پھر سارا مسئلہ حل ہو جائے گا، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

"خدایا۔ کاش ایک ایسا انسان بھی ہوتا جو دل۔ دماغ اور ہاتھ رکھتا۔

Scanned by CamScanner

ان چند عظیم سادہ دل انسانوں کی طرح جو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے چلے گئے ہیں
شور و غوغا سے بھرپور اس سرزمین میں ایک خاموش، طاقتور انسان
مجھے اس کی پروا نہیں کہ اسکو کس نام سے پکارتے ہیں
امیر ، مطلق العنان ، یا جمہوریت پسند
وہ جو حکومت کر سکے اور جھوٹ بولنے کی جرأت نہ کرے"

مجھے امید ہے کہ میرے دیرینہ دوست مسٹر میکڈانلڈ خود کو ایسا انسان ثابت کریں گے جس میں حکومت کرنے کی اہلیت ہے اور وہ اپنی پارٹی، اپنے ضمیر، اپنی مردہ بیوی اور اپنے زندہ ملک کو دھوکا دینے کی جرأت نہ کریں گے۔ اور اگر آپ سب لوگ جو مختلف پارٹیوں سے تعلق رکھتے ہیں انکی مدد کریں گے جس طرح سے کہ آپکو کرنی چاہئیے تو میں آپکو یقین دلاتا ہوں کہ تاریخ سازی کا سہرا آپ کے سر ہوگا۔

لیکن جتنا میں اپنے دیرینہ دوست مسٹر ریمزے میکڈانلڈ پر اعتماد کرتا ہوں اس سے زیادہ، ایک جمہوریت پسند شخص ہونے کے باوجود، میں اس آدمی پر بھروسہ کرتا ہوں اور میں آدمی اسے اس لئے کہتا ہوں کہ ایک آدمی بہرصورت آدمی ہے، جس نے دارالامرا کی گیلری میں اس کانفرنس کا افتتاح کیا ہے اور جس کا نام جارج ہے۔ آپ اسے ملک معظم کہیں یا کچھ اور، وہ بہرحال آدمی ہے۔ وہ ہندوستان کو اپنے موجودہ اور سابق وزرا سے زیادہ جانتا ہے اور میں اس سے امید رکھتا ہوں کہ وہ ۳۲ کروڑ انسانوں سے، جو دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ ہیں، انصاف کرے گا۔ اور میرا یہ یقین والیان ریاست کے حیرت انگیز اظہار حب الوطنی سے اور زیادہ قوی ہو جاتا ہے جو میرے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں اور جن کا شمار ہندوستان کے قدامت پسندوں میں ہے۔ لارڈ پیل اور لارڈ ریڈنگ کے لئے یہ حقیقت ایک انکشاف ہوسکتی ہے لیکن میرے نزدیک اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔ ایک لحاظ سے میری ایک منفرد حیثیت ہے۔ میں برطانوی ہند کا باشندہ ہوں حالانکہ انڈین سول سروس کے امتحان میں یہ کہہ کر مجھے شرکت کی اجازت نہیں دی جارہی تھی کہ میری پیدائش برطانوی ہند

میں نہیں ہوئی ہے۔ مجھے اول گا شرطیہ اجازت دی گئی اور جب میری ماں نے مزید ثبوت
فراہم کر دیئے تب یہ اجازت غیر مشروط کی گئی۔ لیکن میں ایک ہندوستانی ریاست کا
باشندہ بھی ہوں اور غالباً اس حیثیت سے بھی اس کانفرنس میں میری ایک انفرادیت
ہے۔ میں اِس ریاست میں پیدا ہوا تھا اور اسکی میں نے خدمت کی ہے۔ ایک دوسری
ریاست، بڑودہ، کی خدمت کا شرف بھی مجھے حاصل ہے اور میرے آقا مہاراجہ گائیکوار
یہاں موجود ہیں۔ میں نے ۷ برس تک انکا نمک کھایا ہے اور دو برس ہوئے جب میں
قریب مرگ تھا تو ایک دوسرے والی ریاست مہاراجہ الور نے اپنے خرچ سے مجھے
یہاں اپنے ذاتی معالج کے پاس بھیجا۔ اور پھر شملہ میں دوبارہ جب میں اپنی زندگی سے
مایوس ہو چکا تھا تو ایک والی ریاست نواب صاحب بھوپال نے، جن کا میں ایک زمانہ
میں اتالیق مقرر ہونے والا تھا، حقیقی مہمان نوازی کا ثبوت دیا اور اپنے مہمان خانہ
کو میرے لئے اسپتال میں تبدیل کر دیا۔ حکومت برطانیہ نے اسکی تقلید ابھی نہیں کی ہے۔
لیکن وہ بھی ایسا کر سکتی ہے اگر اپنے تمام اسپتالوں میں مجھے علاج کرانے کی مراعات دے۔
جب میں شملہ کے اسپتال میں داخل ہوا تو میں نے ایک خاتون اور ایک فوجی افسر کو
جنکی جلد ہی شادی ہونے والی تھی نہایت دانش مندی سے ایک دوسرے سے علیحدہ
رکھا۔ دونوں بیمار تھے اور میں نے دونوں کے بیچ کا کمرہ لے لیا۔ خاتون نے جب
ایک عجیب وضع کے ہندوستانی کو یوروپین کوارٹر میں آتے دیکھا تو ڈاکٹر سے دریافت
کیا کہ اِس شخص کو کون سی بیماری لاحق ہے۔ ڈاکٹر نے جواب دیا کہ مجھ سے یہ پوچھئے کہ
اسکو کون سی بیماری لاحق نہیں ہے۔ میری یہ کیفیت ہے کہ قلب کی حالت درست نہیں ہے
بینائی میں فرق آگیا ہے، پاؤں متورم ہیں، ذیابطیس کا عارضہ ہے۔ بیماریوں کی
اس طویل فہرست سے جو میں نے پیش کی ہے میرے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ کہیں
کرنل گڈنی ایک طبیب کی حیثیت سے تشریح امراض کے معاملہ میں مجھے اپنا رقیب نہ سمجھ
لیں۔ میں کہتا ہوں کہ جبکہ آدمی کے حواس بجا ہیں وہ اِن بیماریوں کے ساتھ سات میل کا سفر
بھی طے نہیں کر سکتا لیکن میں خشکی اور سمندر کے سات ہزار میل کا سفر کر کے یہاں آیا

ہوں کیونکہ جہاں ہندوستان اور مسلمان کا معاملہ آجاتا ہے میری حالت دیوانوں کی سی ہو جاتی ہے اور جیسا کہ 'ڈیلی میل' نے کہا ہے میں حکومت کا باغی ہونے کے بجائے اپنے ملک سے غداری اور حکومت سے تعاون کر رہا ہوں۔ میں عرض کرونگا کہ اِس کام کی طرح کسی اور کام میں بھی جو اللہ کی راہ میں ہو میں شیطان کے ساتھ بھی تعاون کرنے کو تیار ہوں۔

مجھے امید ہے کہ اپنی علالت، امراض اور دوسرے ملاقات کے متعلق میری اس طولانی تمہید کو آپ معاف کریں گے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج وہ تنہا مقصد جس کے لئے میں آیا ہوں یہ ہے کہ میں اپنے ملک کو اسی صورت میں واپس جاؤں گا جب ایسی آزادی جس پر آزادی کا اطلاق ہو سکے میرے ہاتھ میں ہو۔ میں ایک غلام ملک کو واپس نہیں جاؤں گا۔ میں ایک غیر ملک میں بشرطیکہ وہ ایک آزاد ملک ہو مرنے کو ترجیح دوں گا اور اگر آپ ہمکو ہندوستان میں آزادی نہیں دیں گے تو آپکو یہاں مجھے ایک قبر دینی پڑے گی۔

میں قدامت پسندوں کا ذکر اظہار تشکر سے شروع کروں گا۔ جب مسٹر بالڈون سے میری ملاقات اس ڈنر پر ہوئی جس میں حکومت نے اپنی مہمان نوازی سے ہمکو مدعو کیا تھا (اس وقت میں واقعی بہت علیل تھا اور مجھکو اپنے بستر پر ہونا چاہئے تھا) تو میں اس انتظار میں رہا کہ وہ اپنا پائپ نکالیں، اور شکر ہے کہ انھوں نے مجھے ناامید نہیں کیا۔ اس وقت میں اُن کے پاس گیا اور اُن سے کہا کہ آپ نے دو طرح سے تاریخ سازی کی ہے۔ ایک تو یہ کہ گو آپ قدامت پسند ہیں اور عرف عام میں جو لوگ آرام طلب امرا کہلاتے ہیں اُن کی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں مگر آپ نے کم از کم اتنی انسانیت تو برتی کہ جہاں ڈنر کے بعد صرف کردنا سگار پیا جا سکتا تھا وہاں اب اس کی اجازت ہے کہ جس کا جی چاہے اپنا تمباکو نکالے، جیسا کہ میں آکسفورڈ میں کیا کرتا تھا، اسکو اپنے پائپ میں بھرے اور اس کے کش لگائے۔ یہی نہیں بلکہ جیسا میں نے ان سے کہا انھوں نے ایک تاریخی کام اور بھی کیا ہے۔ انھوں نے لارڈ اروِن کی شکل میں ایک

قدامت پسند وائسرائے بھیجا ہے۔ اگر آج کسی نے سلطنت برطانیہ کو تباہی سے بچایا ہے تو وہ یہی طویل اقامت۔ ڈبلا پتلا دین عیسوی کا پیرو ہے۔ اگر لارڈ ارون آج نہ ہوتے تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا افتاد پڑی ہوتی۔ کم سے کم میں تو اپنے خیالات بدلنے کا جیسا کہ میرے متعلق کہا جاتا ہے، گنہگار نہ ہوتا اور ہم لوگ اس گول میز کانفرنس میں شریک نہ ہوئے ہوتے۔ ہم امن، دوستی اور آزادی کی خاطر یہاں آئے ہیں اور مجھ کو امید ہے کہ ہم یہ سب کچھ لے کر یہاں سے جائیں گے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو ہم واپس جا کر مجاہدین کی صفوں میں شامل ہو جائیں گے جہاں ہم دس برس پہلے تھے۔ اس وقت وہ ہم پر ملک سے غداری کا الزام رکھتے ہیں، اس وقت آپ ہمکو باغی کہیں گے اور قانون کی حمایت سے ہمکو محروم قرار دیں گے۔ لیکن ہمکو اس کی مطلق پروا نہیں ہے۔ ابھی میں نے لارڈ ارون کے متعلق کچھ کہا ہے لیکن میں اس کا اطلاق انکی حکومت پر نہیں کرتا۔ انکی حکومت نے معاملات کو بہت افسوسناک طریقے سے بگاڑا ہے۔ اس نے جو مراسلہ بھیجا ہے اس کا اگر کوئی بہتر پہلو ہے تو صرف یہ ہے کہ اس سے ہمکو ایک تاریخی دستاویز اور ہاتھ آ گئی ہے۔ اب ہمکو تنہا سائمن کمیشن ہی کی رپورٹ پر غور کرنا نہیں ہے۔ یہ مراسلہ ایک بہت مایوس کن دستاویز ہے۔ ہمارے لئے اب اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ ہم اپنی تاریخی دستاویز خود مرتب کریں دو بڑے ملکوں کے بہترین دل و دماغ یہاں موجود ہیں اور بہتر ہے جنکو یہاں ہونا چاہئے تھا ہندوستانی جیلوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ مسٹر جیکر۔ سر تیج بہادر سپرو اور میں نے وائسرائے اور گاندھی کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کی مگر اس میں ہم ناکام رہے۔ سب سے پہلے میں نے کوشش کی مگر میں ناکام رہا، لیکن مجھے امید ہے کہ اس مرتبہ ہم لوگ آزادی لے کر واپس جائیں گے تو ناکام نہیں ہونگے۔

لارڈ پیل کہتے ہیں " بالکل بجا ہے لیکن جب آپ اس دستور کو جیسے آپ چاہتے ہیں لے کر واپس جائیں گے تو وہ لوگ جو تعاون نہیں کر رہے ہیں اسکو آپکے ہاتھوں سے چھین لیں گے " چھین لیں گے ؟ اگر میں انگریزوں سے لڑ سکتا ہوں تو میں ہندوستانیو

سے بھی لڑ سکتا ہوں۔ مگر مجھے کوئی ایسی چیز تو دیجئے جس کے لئے میں لڑ سکوں۔ مجھ سے یہ توقع نہ رکھئے کہ میں یہاں سے غلامی کا پروانہ لیکر واپس جاؤں اور اپنے ہی ملک والوں سے لڑوں۔ میں ایسا نہیں کرسکوں گا اور اگر میں اسکی کوشش بھی کروں گا تو ناکام رہوں گا۔ لیکن اگر آزادی میرے ہاتھ میں ہو گی تو میں بہت خوشی سے ان لوگوں کے پاس واپس جاؤں گا جنکی ترجمانی میرے دوست مسٹر جیکر نے اپنی تقریریں کی ہے۔ مسٹر جیکر نے ہندوستان کے نوجوانوں کی ترجمانی کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ گو عمر میں میں اُن سے بڑا ہوں لیکن جرأت، ہمت اور حق کے لئے لڑنے میں اُن سے کم عمر ہوں۔ جب وہ عدالتوں میں پریکٹس کرتے تھے تو میں تحریک عدم تعاون میں شریک تھا (یہاں مسٹر جیکر نے اثبات میں گردن ہلائی) وہ جیل میں میرے ساتھ نہ تھے۔ میں اور میرے بھائی سب سے پہلے شخص تھے جنکو لارڈ ریڈنگ نے جیل بھیجا تھا۔ لیکن اسکی وجہ سے مجھے اُن سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ البتہ میں بھی یہ اختیار چاہتا ہوں کہ اگر لارڈ ریڈنگ پھر ہندوستان میں غلط راستہ پر چلیں تو میں انھیں جیل بھیج سکوں

میں آپ سے ڈومینین اسٹیٹس (درجہ نوآبادیات) مانگنے نہیں آیا ہوں۔ ڈومینین اسٹیٹس پر مجھے اعتبار نہیں ہے۔ میں سوائے مکمل آزادی کے کسی اور چیز کے لینے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ ۱۹۲۷ء میں مدراس میں ایک تجویز کے ذریعہ سے ہم نے اسی کو اپنا نصب العین قرار دیا تھا۔ ۱۹۲۸ء میں آل پارٹیز کنونشن میں نہرو رپورٹ کو منظور کرنے کی تحریک پیش کی گئی تھی جسکی پہلی دفعہ ڈومینین اسٹیٹس کے متعلق تھی۔ میرے پرانے سکریٹری پنڈت جواہر لعل نہرو کو بھی جو آج کانگریس کے پریسیڈنٹ ہیں اُن کے باپ نے اس تحریک سے اتفاق کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ فارسی میں ایک کہاوت ہے "سگ باش برادر خورد مباش"۔ اور اگر آپ میرے نحیم شحیم بھائی کیطرف نظر کریں جو یہاں موجود ہیں اور جنکو مسٹر وج ووڈ بن "سات فٹ لمبا اور پانچ فٹ چوڑا" کہا کرتے تھے تو آپ کو یقین آجائیگا کہ میں اس کہاوت سے اتفاق کرتا ہوں۔ جواہر لعل نہرو کے متعلق میں یہ کہوں گا کہ بلّی ہونا بہتر ہے بجائے اس کے کہ اپنے باپ کا بیٹا ہو۔ کیونکہ

یہ غریب جواہر لعل کے باپ ہی تھے جنھوں نے کانگریس پریسیڈنٹ کی حیثیت سے ۱۹۲۸ء میں کلکتہ میں اُنکا گلا دبا کر ان کی زبان بند کر دی تھی۔ جب وہ مکمل آزادی مانگنے کے لئے تیار نہیں ہوئے تو میں نے اُنکے بجائے کھڑے ہو کر ڈومینین اسٹیٹس کی دفعہ کی مخالفت کی۔ لیکن ۱۹۲۹ء میں میں بھی جواہر لعل کی طرح مجبور ہو گیا کیونکہ اگر ایک دفعہ مکمل آزادی کا عقیدہ تسلیم کر لیا جائے تو پھر کانگریس میں کوئی ایسا شخص شریک نہیں ہو سکتا جو اس عقیدہ پر ایمان نہ رکھتا ہو اور میں گفت و شنید کے لئے دروازہ کھلا رکھنا چاہتا تھا۔ اسکو بند نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لارڈ اردن کی جو ایک قدامت پسند وائسرائے تھے حیثیت ایک "مقامی شخص" کی تھی اور جب وہ یہاں آئے تو جو کچھ انھوں نے دیکھا اس سے کافی متاثر ہوئے۔ لندن پہونچ کر ہم کو معلوم ہوا کہ اب ہر شخص "عوام" سے اپیل کر رہا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ عوام کی آواز کبھی سُنی بھی جاتی ہے یا نہیں لیکن لارڈ رادرمیر اور لارڈ بیور بروک اور تمام اور لوگ اب یہی کہہ رہے ہیں کہ آخری فیصلہ عوام ہی کی عدالت سے ہو سکتا ہے۔ ہندوستان میں "مقامی شخص" ہی آخری فیصلہ کا اختیار رکھتا ہے۔ خیر جو کچھ بھی ہو "مقامی آدمی" یہاں آیا اور اس نے عوام کے سربراہ سے جو اس وقت کرسی صدارت پر متمکن ہیں گفتگو کی۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے اس شخص پر تبلیغ کی جو پہلے ہی ایمان لا چکا تھا۔ انھوں نے مسٹر بالڈون کو راضی کر لیا اور اس طرح کچھ اور قدامت پسندوں اور بہتوں کو رام کر کے یہ اعلان کیا کہ ۱۹۱۷ء میں جب انھوں نے ذمہ دار حکومت، دینے کے لیے کہا تھا اس کا مطلب ڈومینین اسٹیٹس ہی تھا۔ اس طرح وہ غلط فہمی دور ہو گئی جو ہندوستانی مجلس قانون ساز کے ایک یادگار اجلاس میں ۱۹۲۴ء میں محکمہ داخلہ کے سربراہ نے پیدا کر دی تھی۔ مجھے بہت خوشی ہے کہ وہ آج یہاں موجود ہیں۔

جیسا کہ میں نے دو تین دن ہوئے کہا تھا ہندوستان اس تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے کہ وہ دنیا کی حیرانی کا باعث ہوگا۔ ہم اس وقت تک واپس نہیں جائیں گے جب تک ایک ڈومینین کی تاسیس نہ ہو جائے۔ لیکن اگر ہم کو اسکے

Scanned by CamScanner

بغیر ہندوستان جانا پڑا تو آپ یقین کیجئے کہ ہم ایک ایسی ڈومینین کو واپس جائیں گے جو ہاتھ سے نکل چکی ہو گی۔ ہم ایک دوسرے امریکہ کو واپس جائیں گے! اس وقت آپ دیکھیں گے کہ دولت مشترکہ برطانیہ یا برطانوی شہنشاہیت کے اندر نہیں بلکہ اس کے باہر ہندوستانی والیان ریاست ڈاکٹر مونجے، مسٹر جیکر اور میرے بھائی سب نے ملکر ہندوستان میں متحدہ ریاست کی ایک آزاد حکومت قائم کر لی ہے یہی نہیں بلکہ یہ حکومت اس سے بھی زیادہ ہو گی۔ جیسا کہ آکسفورڈ سے رخصت ہوتے وقت جسکو کہ ایک مدت ہوئی میں نے لکھا تھا ہندوستان میں ہمارے پاس امریکہ سے بہتر کوئی چیز ہو گی کیونکہ ہمارے پاس متحدہ ریاستیں ہی نہیں ہونگی بلکہ متحدہ مذاہب بھی ہونگے۔ بقول شاعر:

"یکسانیت میں نہیں بلکہ اختلاف میں یک رنگی
ہر شخص اپنا اور دوسروں کا احترام کرنے والا
شخصی خصوصیت میں مختلف
لیکن محبت کرنے والوں کی طرح ایک دوسرے کی مانند"

ان ارمانوں کو اپنے دلوں میں لیکر ہم یہاں آئے ہیں لیکن ہو گا کیا اس کا انحصار ہمارے قدامت پسند دوستوں، ہمارے انتہا پسند دوستوں، ہمارے مزدور پارٹی کے دوستوں اور سب سے بڑھ کر ایک خاص شخص پر ہے جس پر مجھے انگلستان میں سب سے زیادہ اعتماد ہے۔ یعنی شہنشاہ جارج جو نیک دل وکٹوریہ کے پوتے ہیں جن کی ہندوستان سے محبت کی حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا اور جنکی تمام زندگی ہندوستان کے منشور آزادی سے عبارت ہے۔ انکی حکومت میں تاریخ پھر سے یوں لکھی جائے گی کہ جارج سوم نے امریکہ کھو دیا تھا لیکن جارج پنجم نے ہندوستان جیت لیا۔

ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ راہ میں مشکلات ہیں۔ ہندوستانی ریاستوں کی طرف ہمکو توجہ دلائی جاتی ہے لیکن میں خود ایک ایسی ہی ریاست کا باشندہ ہوں اور میں

جانتا ہوں کہ اُنکی وجہ سے کوئی مشکل نہیں ہے۔ پھر کہا جاتا ہے کہ فوج کا مسئلہ ہے۔ لیکن فوج کا کیا مسئلہ ہے؟ برطانیہ کے خلاف یہ بہت بڑا الزام ہے کہ فوج ہماری نہیں ہے اور اگر آپ فوج کو کبھی بھی بہانہ بنائیں گے تو آپ خود اپنے منہ سے اپنے کو مجرم قرار دائیں گے۔ مجھے نہایت صفائی اور ایمانداری سے لیکن دوستانہ طریقہ سے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ آپ کا سب سے بڑا قصور یہی ہے کہ آپ نے فوج کو ناکارہ کر دیا۔ مجھے بہت خوشی ہے کہ میرے دوست ڈاکٹر مونجے نعرہ تحسین بلند کر رہے ہیں۔ مجھے ان سے سن کر رنج ہوا کہ ہمارے ہم وطنوں پر گولیاں برسائی گئیں جس کی وجہ سے اُنکو کچھ عرصہ کے لئے پسپائی اختیار کرنی پڑی۔ لیکن وہ پھر واپس آ رہے ہیں۔ ہمارے ملک میں ۳۲ کروڑ آدمی ہیں۔ اگر وہ لاکھوں کی تعداد میں قحط اور وبا سے مر جاتے ہیں تو برطانیہ کی گولیوں کا شکار ہو جانے میں اُن کے لئے کیا امر مانع ہے۔ یہی سبق ہے جو گاندھی جی نے ہمکو دیا ہے اور یہی وقت ہے جب ہمکو اس سبق کو سیکھنا چاہئے۔ ۱۹۱۳ء میں جب گاندھی جی جنوبی افریقہ میں اپنی تحریک چلا رہے تھے مسٹر جی کے چیسٹرٹن نے اِسیکس ہال میں ایک جلسے کی صدارت کی تھی اور مجھے تقریر کرنے کی دعوت دی تھی۔ مجھ سے پہلے اور دوسرے مقرر گاندھی جی کے فلسفہ پر روشنی ڈال چکے تھے۔ میں نے کہا کہ اس کے متعلق ایک بات ذہن نشین کر لیجئے۔ یہ فلسفہ گاندھی جی کا ہو یا ٹالسٹائے کا، یا حضرت عیسیٰ کا یا میرا، یہ ایک عالم گیر انسانی فلسفہ ہے۔ جنگ میں محض کسی کو ہلاک کرنے کی خواہش سے فتح نہیں حاصل ہوتی۔ ہم ہندوستانیوں کے پاس گو ہلاک کرنے کی طاقت نہیں ہے لیکن جس وقت ہمارے اندر جان دینے کا جذبہ بیدار ہو گیا تو ہماری اس قدر کثیر تعداد ہی فیصلہ کن ثابت ہوگی۔ ۳۲ کروڑ انسان ہلاک نہیں کئے جا سکتے۔ اتنوں کو ہلاک کرنے کے لئے حربے بھی مل سکیں تو اُن کیلئے آپ کے پاس روپیہ نہیں ہے۔ اور اگر آپکو سامان ہلاکت دستیاب بھی ہو جائے تو آپ میں ۳۲ کروڑ انسانوں کو ہلاک کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ ایک آزاد اور متحد ہندوستان کی تشکیل کے لیے ہمکو سرفروشی کے جذبے کی ضرورت

Scanned by CamScanner

ہے اور یہ جذبہ بہت تیزی سے پیدا ہو رہا ہے جس وقت یہ جذبہ پورے طور سے بیدار ہو جائے گا اس وقت آپ کیا کریں گے ؟ میں ایک لمحہ کے لیے بھی اس کا تصور نہیں کر سکتا کہ انگلستان بھر میں ستر آدمی بھی آپ کو ایسے سنگدل اور بے رحم مل جائیں گے جو نہتے اور پر امن آدمیوں پر جو اپنے ملک کی آزادی کی خاطر جان دینے کے لیے تیار ہیں مسلسل گولیاں برساتے رہیں۔ میں انگریز سپاہیوں کے متعلق اتنی خراب رائے نہیں رکھتا۔

اصل میں جو مسئلہ برابر ہمارے لئے پریشان کن رہا ہے وہ ایک تیسرا مسئلہ ہے، یعنی ہندو مسلمانوں کا مسئلہ لیکن یہ میرے لیے کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندو مسلم مسئلہ قومی مسئلہ کی طرح آپ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ البتہ اس کی کل ذمہ داری آپ پر نہیں ہے۔ یہ تو وہی پرانا طریقہ ہے کہ پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو؛ لیکن یہاں ایک تقسیم کار بھی ہے یعنی ہم لوگ پھوٹ ڈالتے ہیں اور آپ حکومت کرتے ہیں جس وقت بھی ہم یہ فیصلہ کرلیں گے کہ ہم آپس میں نہیں لڑیں گے آپ کے لیے حکومت کرنا جیسے کہ آپ آج کر رہے ہیں ناممکن ہو جائیگا۔ ہم اس عزم کے ساتھ یہاں آئے ہیں کہ ہم آپس میں نہیں لڑیں گے۔ میں ہر برطانوی عورت اور مرد کو جو یہ خیال کرتا ہے کہ ہماری قسمت کا فیصلہ اس کے ہاتھوں میں ہے یقین دلاتا ہوں کہ ہندو اور مسلمانوں میں آج صرف یہی جھگڑا ہے کہ مسلمان ہندو کے غلبہ اقتدار سے خائف ہے اور ہندو مسلمان کے۔ (ڈاکٹر مونجے نے یہاں دخل دیتے ہوئے کہا کہ ہندو کبھی خوف نہیں کھاتا)۔ مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی۔ میرے ملک میں بھینس اسی وقت حملہ کرتی ہے جب اسے کوئی خوف لاحق ہوتا ہے، اور ایک ہندو گائے کا کتنا ہی احترام کرے میں یہ سن کر خوش ہوا کہ اس کو بھینس کی طرح کوئی خوف لاحق نہیں ہے۔ میں اس خوف کو دور کرنا چاہتا ہوں، جس طرح ہندو اور مسلمان آج لڑ رہے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ برطانوی تسلط کو ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئیے کہ برطانوی اقتدار

کا خاتمہ یقینی ہے۔ میرے بھائی نے ۲۷ برس تک حکومت کی ملازمت کی مگر ایک بات انھوں نے میرے لئے بھی کی یعنی مجھ کو آکسفورڈ بھیجا۔ عدم تعاون کی تحریک کے زمانہ میں وہ ہمیشہ مجھ کو طعنہ دیا کرتے تھے کہ تمہارے دل میں ایک مقام کی جگہ ہے جسکو آکسفورڈ کہتے ہیں۔ مجھے اس کا اقرار ہے۔ میں نے ۴ سال وہاں گزارے ہیں اور میرے دل میں اس وقت کی پرمسرّت یادیں اب بھی تازہ ہیں۔ میں ان یادوں کو بھولنا نہیں چاہتا۔ میرے دل میں بیشک اپنی مادر درسگاہ کے لئے جگہ ہے۔ مگر میں اپنے بھائی کو بھی طعنہ دے سکتا ہوں کراچی میں ہمارے خلاف جو مقدمہ چلا تھا اس میں جیوری نے ہمکو بے قصور ٹھہرایا تھا۔ جیوری نے جس میں ایک انگریز بھی تھا ہماری رہائی کا فیصلہ اس لئے کیا کہ ہم لوگ نہایت خوش مزاج تھے۔ اس وقت میرے بڑے بھائی نے کہا تھا "اگر میرا یہ فرض بھی ہو جائے کہ میں اس پہلے انگریز کو جس سے میری ملاقات ہو ہلاک کر دوں تو بھی اگر اسکی آنکھیں نیلی ہوں گی تو میرا خنجر اس پر نہیں چلے گا کیونکہ مجھے اس وقت اپنے پرانے علی گڑھ کالج کے پرنسپل تھیوڈور بیک کی آنکھیں یاد آجائیں گی۔" یہاں علی گڑھ کے بہت سے پرانے طلبا موجود ہیں جو اس بات کی شہادت دیں گے کہ ہم لوگ جنکی تربیت بیک نے علی گڑھ میں کی ہے انگریزوں کے لئے ہمیشہ اپنے دل میں جگہ رکھتے ہیں۔ اس لئے اگر برطانوی اقتدار کا خاتمہ ہوتا ہے، اور یہ خاتمہ یہیں ہوگا، تو کم سے کم انگریزوں سے دوستانہ تعلقات کا خاتمہ تو نہ ہونے دیجئے۔ ہمارے دل میں برطانیہ کے لیے محبّت ہے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اسکو قائم رہنے دیجئے۔

اب میں ایک لفظ مسلمانوں کے متعلق کہنا چاہتا ہوں جس کے بارے میں کسی دوسرے وقت تفصیل سے گفتگو کروں گا۔ انگلستان میں اکثر اصحاب ہم سے سوال کرتے ہیں کہ یہ ہندو مسلم سوال سیاست میں کیوں اٹھتا ہے اور اس کا ان چیزوں سے کیا واسطہ ہے۔ میرا جواب یہ ہے کہ آپ کا تخیل مذہب کے متعلق غلط ہوگا اگر سیاست کو اس کے باہر رکھا جائے۔ مذہب میرے خیال میں نہ کسی عقیدہ کا نام

ہے اور نہ کسی طریقہ عبادت کا۔ مذہب زندگی کی ایک تعبیر ہے۔ میرے پاس ایک تمدن ہے، ایک سیاسی نظام ہے، ایک نظریہ زندگی ہے، اور اسلام ان سب کا امتزاج ہے۔ جہاں تک احکام خداوندی کے بجا لانے کا تعلق ہے میں اوّل بھی مسلمان ہوں۔ دوئم بھی مسلمان ہوں اور آخر میں بھی مسلمان ہوں یعنی میں مسلمان ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کی سلطنت یا قوم میں اس سیاسی نظام، اس تمدن، اس ضابطہ اخلاق، اس امتزاج کو چھوڑ کر شامل ہو جاؤں تو میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔ میرا پہلا فرض اپنے خالق کی رضاجوئی ہے نہ کہ ملک معظم یا میرے ساتھ ڈاکٹر مونجے کی۔ اور یہی حال ڈاکٹر مونجے کا ہے۔ احکام خداوندی کی بجاآوری میں اُن کو پہلے ہندو ہونا چاہیئے اور مجھ کو مسلمان۔ لیکن جہاں ہندوستان کا سوال آتا ہے، جہاں ہندوستان کی آزادی کا سوال آتا ہے یا جہاں ہندوستان کی فلاح وبہبود کا سوال آتا ہے میں اول بھی ہندوستانی ہوں، دوئم بھی ہندوستانی ہوں، اور آخر میں بھی ہندوستانی ہوں، اور ہندوستانی ہونے کے علاوہ کچھ نہیں ہوں۔

میں دو برابر کے دائروں سے تعلق رکھتا ہوں جو ہم مرکز نہیں ہیں۔ ایک ہندوستان ہے اور دوسرا دنیائے اسلام ہے۔ جب میں تحریک خلافت کے وفد کے سربراہ کی حیثیت سے ۱۹۲۰ء میں انگلستان آیا تو میرے دوستوں نے کہا تھا کہ ہماری اسٹیشنری کے لئے کوئی طغرا ہونا چاہیئے۔ میں نے یہ طغرا دو دائروں کی شکل میں بنایا۔ ایک دائرے میں لفظ ہندوستان، لکھا اور دوسرے میں لفظ 'خلافت' کے ساتھ اسلام۔ ہم بحیثیت ہندوستانی مسلمان کے دونوں دائروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہر دائرے میں ۳۰ کروڑ انسان ہیں۔ ان دائروں میں سے ہم کسی کو نہیں چھوڑ سکتے۔ ہم قوم پرست نہیں ہیں۔ ہمارا رتبہ اس سے بھی بلند ہے اور بحیثیت مسلمان کے میرا عقیدہ ہے کہ خدا نے انسان کو پیدا کیا اور

Scanned by CamScanner

شیطان نے قوموں کو۔ قوم پرستی تفریق پیدا کرتی ہے اور ہمارا مذہب اتحاد کا داعی ہے کوئی مذہبی یا صلیبی جنگ اس قدر ہلاکت خیز نہیں ہوئی ہے جتنی کہ آپکی گزشتہ جنگ اور یہ آپکی قوم پرستی کی جنگ تھی، نہ کہ میرا جہاد۔

مگر جہاں میرے ملک کا تعلق ہے، جہاں محاصل تشخیص کئے جاتے ہیں، جہاں ہماری فصلوں کا واسطہ ہے، اور جہاں عام زندگی کے ہزاروں مسائل کا تعلق ہے جن سے ہندوستان کی فلاح و بہبود کا واسطہ ہے، وہاں میں کس طرح کہہ سکتا ہوں کہ میں "مسلم ہوں اور وہ ہندو"۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف کے بارہ میں آپ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں اس لئے کہ اسکی بنیاد تمام تر ایک کا دوسرے پر غلبہ حاصل کر لینے کے خوف پر ہے۔ ہندوستان کو بے دست و پا بنا دینے کے علاوہ ایک اور گناہ برطانیہ کا یہ بھی ہے کہ اس نے ہندوستان کی غلط تاریخ مرتب کی اور اس کو ہمارے اسکولوں میں رائج کیا اور اسی وجہ سے ہمارے بچوں نے ہندوستان کی مسخ شدہ تاریخ پڑھی۔ جو جھگڑے اکثر ہمکو اپنی سڑکوں پر تیوہاروں کے موقع پر نظر آتے ہیں، اور جن تنازعوں کے محرکات ہمارے دانشوروں میں انکو غیر دانشور کہوں گا ــــ کے دل میں بٹھا دئے گئے ہیں سب اُسی غلط تاریخ کا نتیجہ ہیں جو سیاسی اغراض سے ہمارے اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ اگر وہ انتقامی ذہنیت جو ہندوستان میں چند لوگوں کی سیاست میں کارفرما ہے واقعی موجود ہوتی اور اس حد تک موجود ہوتی جتنی کہ آج ہے، اور مسلمان ہر جگہ ۲۵ فیصدی کی اقلیت میں اور ہندو ۶۶ فیصدی کی اکثریت میں ہوتے تو مجھے امید کی کوئی کرن آج نظر نہ آتی۔ مگر ہمارے صوفیوں اور سپاہیوں کا بھلا ہو کہ ان کی وجہ سے ایسے صوبے بھی ہیں جیسے کہ میرے دوست ڈاکٹر مونجے کا صوبہ جس میں ہم ۴ فی صدی ہیں اور ایسے بھی جیسے میرے دوست نواب سر عبدالقیوم کا صوبہ جس میں ہم ۹۳ فیصدی ہیں اور جس کے لئے ہم اس آزادی کا مطالبہ کر رہے ہیں جو دوسرے صوبوں کو حاصل ہے۔ سندھ کا پرانا صوبہ بھی ہے جہاں مسلمان پہلے پہل آئے اور جہاں وہ

۳ے فیصدی ہیں۔ پنجاب میں اُنکی تعداد ۵۶ فیصد ہے اور بنگال میں ۵۵۔۵ ۔اس سے ہمکو تحفظ حاصل ہو جاتا ہے کیونکہ ہمکو وہی ضمانت مل جاتی ہے جو ہندوؤں کو اُن صوبوں میں حاصل ہے جن میں وہ بڑی اکثریت میں ہیں۔ میں آپ کو احساس دلانا چاہتا ہوں کہ آپ پہلی بار ہندوستان میں انقلاب لا رہے ہیں۔ یعنی یہ پہلی دفعہ ہے کہ یہاں اکثریت کی حکومت ہوگی۔ رام چندر جی کے زمانہ میں اکثریت کی حکومت نہیں تھی ورنہ اُنکو جلا وطن نہ کیا جاتا۔ پانڈو اور کورو راجگان جنھوں نے اپنی سلطنتیں جوئے میں ہار دیں کے وقت میں اکثریت کی حکومت نہیں تھی اور نہ محمود غزنوی، اکبر اور اورنگ زیب کے زمانے میں۔ اسی طرح شیواجی، رنجیت سنگھ، وارن ہیسٹنگز اور کلائیو کے زمانے میں بھی اکثریت کی حکومت نہیں تھی۔ اب اس وقت لارڈ اروِن کے زمانہ میں ہم ہندوستان میں پہلی دفعہ اکثریت کی حکومت قائم کر رہے ہیں، اور اقلیت میں ہوتے ہوئے بھی میں اکثریت کی حکومت منظور کرتا ہوں گو میں خوب جانتا ہوں کہ اگر ۵۱ فیصدی آدمی یہ کہیں کہ دو اور دو پانچ ہوتے ہیں اور ۴۹ فیصدی آدمی یہ کہیں کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں، اور ۵۱ فیصدی کے یہ کہنے سے کہ دو اور دو پانچ ہوتے ہیں یہ نہیں ہو سکتا کہ دو اور دو واقعی پانچ ہو جائیں، پھر بھی میں اکثریت کا حکم ماننے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن خوش قسمتی سے چند صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور ایک وفاقی حکومت کے قیام سے جو ہندوستان کے لئے موزوں ہے نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے بلکہ ہندوستانی والیان ریاست کا بھی، اور یہی ہمارے موافق ہے۔ ہندوستان میں مرکزی اور غیر مرکزی رجحانات کا اس قدر توازن پایا جاتا ہے کہ وفاقی حکومت کا قیام مستقبل کے لیے صرف ایک مطمح نظر ہی نہیں ہے بلکہ فوری طور پر ممکن ہے۔ ہم اس کانفرنس سے اسی وقت جائیں گے جب ہندوستانی ریاستوں سے نئے سمجھوتے ہو کر اُنکی اور برطانیہ کی رضامندی سے ہندوستان میں وفاقی حکومت قائم ہو جائیگی۔

Scanned by CamScanner

میں نے یہاں لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ والیانِ ریاست کی منظوری کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں اِن اصحابِ بالا نشین، (ہز ہائینس) کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم خاک نشین، آپ کی رضا مندی کے بغیر کچھ نہیں کریں گے۔ مگر جب ۱۸۵۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اختیارات برطانیہ کو منتقل ہوئے تھے تو کسی نے آپ کی منظوری حاصل کرنے کا خیال بھی ظاہر نہیں کیا تھا کسی نے آپ سے اخلاقاً یہ بھی نہیں کہا تھا کہ اگر آپ کی اجازت ہو تو ہم ایسا کریں۔ آپ کا برطانیہ سے واسطہ خود بخود قائم ہو گیا تھا مگر یہ واسطہ ایک ایسے شاہی خاندان سے ہوا تھا جس میں بادشاہ اور ملکہ سب ہی نیک لوگ تھے جو لپنے ضمیر کو اپنا بادشاہ مانتے تھے اور اسی لئے ہم کو ان سے توقعات ہیں۔

بس میں ایک لفظ اور کہہ کر اپنی تقریر ختم کر دوں گا۔ میں فوج کی بابت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ میں اس کے متعلق اس وقت ایک راز افشا کر رہا ہوں۔ دس سال ہوئے جب ہز رائل ہائنس ڈیوک آف کناٹ ہندوستانی مجالس قانون کا افتتاح کرنے کے لیے بھیجے گئے تھے تو میرے مرحوم دوست سی۔ آر۔ داس نے مجھ کو، مہاتما گاندھی کو اور پنڈت موتی لعل نہرو کو اپنے پاس بلایا تھا۔ آج ہماری آنکھیں انکو اس میز پر ڈھونڈھ رہی ہیں۔ وہ بڑے دور اندیش انسان تھے اور اگر آج وہ زندہ ہوتے تو مہاتما گاندھی اور موتی لعل کو اس میز پر لائے ہوتے۔ گاندھی جی اور میں داس کے مہمان تھے اور میں گاندھی جی کے حاجب (لارڈ چیمبرلین) کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ گاندھی جی کے درشن کرنے اور اُن کے پاؤں چھونے کے لیے لوگ ٹوٹے پڑتے تھے۔ اگر ان کے ہزار پا کے برابر بھی پیر ہوتے تو بھی وہ اُن ہزاروں عقیدتمندوں سے بیٹ نہیں سکتے تھے جو ان کے پیر چھونے کے لیے آئے تھے۔ مجھکو گاندھی جی کو زحمت سے بچانے اور ساتھ ہی ساتھ اس ہجوم کی توقع پوری کرنے میں بڑی پریشانی کا سامنا ہو رہا تھا، اس مجمع میں میں نے دس بارہ طویل القامت آدمی دیکھے جو صافے باندھے ہوئے تھے اور قریب قریب ایک ہی طرح کے کپڑے پہنے

ہوئے تھے۔ میں سمجھا کہ یہ پنجاب کے سی۔ آئی۔ ڈی کے آدمی ہیں۔ اپنے ایک پڑوسی کی رپورٹ پر جو جاسوسی کا کام کرتا تھا جب ۱۹۱۵ء میں میری گرفتاری اور نظربندی ہوئی اس وقت سے مجھے یقین ہے کہ ایسی کوئی جگہ نہیں ہے جہاں خدا اور سی۔ آئی ڈی کے آدمی دونوں موجود نہ ہوں۔ اس لئے جو کچھ بھی میں کہتا ہوں اور جو کچھ کرتا ہوں وہ اس یقین کے ساتھ کہتا اور کرتا ہوں کہ خدا اور برطانوی سی آئی ڈی دونوں موجود ہیں۔ میں نے ان آدمیوں سے پوچھا کہ میں ان کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔ میں حکومت سے سرکشی کر کے سی۔ آئی۔ ڈی کے لیے بہت کچھ کرتا رہا ہوں اور اب مزید خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ اُن لوگوں نے جواب دیا کہ وہ سی۔ آئی۔ ڈی کے نہیں بلکہ فوج کے آدمی ہیں۔ تب میں نے اُن سے پوچھا کہ تم اِس باغیوں کے گھر میں کیا کر رہے ہو؟ انھوں نے جواب دیا کہ وہ اس فوجی دستے کے ساتھ ہیں جو پونا سے ڈیوک آف کناٹ کی معیّت کے لیے لایا گیا ہے اور اِس وقت مہاتما گاندھی کے سلام کو حاضر ہوئے ہیں۔ میں نے کہا کہ اگر وہ مہاتما گاندھی سے ملنا چاہتے ہیں تو میں انکو سیدھے ان کے پاس لے چلوں گا۔ مہاتما گاندھی نے اُن سے سوال کیا کہ اُن کو سوراج سے دلچسپی ہے! انھوں نے کہا کہ ہاں۔ برطانوی فوج کے احترام میں اب میں کھڑے ہوکر میں ان کے الفاظ کو دہراؤں گا۔ گاندھی جی نے ان سے پوچھا "کیا تم کو سوراج سے دلچسپی ہے حالانکہ تم فوج کے آدمی ہو اور ڈیوک آف کناٹ کی حفاظت کے لیے پونا سے آئے ہو کیونکہ بنگال کے لوگوں پر حکومت کو بھروسہ نہیں ہے،، انھوں نے جواب دیا "ابھی کل ہی کی بات ہے ہمارے کرنل نے ریڈ ہر آپ کے متعلق دریافت کیا کہ کیا تم جانتے ہو کہ وہ بنیا گاندھی ہندوستان کے لیے سوراج چاہتا ہے؟ اس کو یقین تھا کہ ہم لوگ جواب دیں گے کہ جی نہیں۔ لیکن ہماری رجمنٹ نے نہایت سکون کے ساتھ جواب دیا کہ جی ہاں، ہم بھی ہندوستان کے لیے سوراج چاہتے ہیں۔ کرنل یہ جواب سن کر ششدر رہ گیا اور پوچھا کہ تم لوگ کیوں سوراج چاہتے ہو۔ ہم نے اس سے کہا کہ جب ہم لڑائی میں شرکت کے لیے

Scanned by CamScanner

یورپ بھیجے گئے تھے تو ہم نے دیکھا کہ شکست کھائے ہوئے بلجیم کے سپاہیوں سے اگر کوئی پوچھتا تھا کہ تم کون ہو تو وہ فخر سے جواب دیتے تھے کہ ہم بلجیم کے باشندے ہیں اور بلجیم کی فوج کے سپاہی ہیں۔ کبھی فرانسیسی شکست کھاکر پیچھے ہٹتے ہوئے آتے تھے تو اُن سے بھی اگر کوئی پوچھتا تھا کہ وہ کون ہیں تو وہ فخر یہ کہتے تھے کہ ہم فرانسیسی فوج کے سپاہی ہیں۔ یہی حال برطانوی فوج کا تھا۔ لیکن ہندوستانی سپاہیوں سے اُنکے فتح حاصل کرنے اور فرانسیسی ساحل کو اکتوبر ۱۹۱۴ء میں ایک نازک موقع پر بچانے کے باوجود اگر کوئی پوچھتا تھا کہ تم کون ہو تو وہ اس طرح فخر کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہم ہندوستانی فوج کے سپاہی ہیں۔ ہم کو کہنا پڑتا تھا کہ ہم برطانیہ کی رعایا ہیں اور حکومت برطانیہ کی فوج سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ہم بھی چاہتے ہیں کہ فخر سے یہ کہہ سکیں کہ ہم ہندوستان کی فوج کے سپاہی ہیں"۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ہندوستانی فوج کے متعلق یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے آپ ہندوستانی فوج میں رائے شماری کرا لیجئے۔ ظاہر ہے کہ غدار اور برطانوی جاسوس تو اس وقت موجود ہی ہوں گے لیکن اگر ہم میں سے بھی چند کو حاضر رہنے دیجئے گا تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ہملوگ اس موضوع پر دوسروں سے کہیں زیادہ جانتے ہیں۔ ہندوستان آج اپنی حفاظت کر سکتا ہے بشرطیکہ آپ ایمانداری سے اس کو ایسا کرنے دیں۔

حکومت ہند کا مراسلہ سائمن کمیشن کی رپورٹ سے ایک قدم آگے ہے اس میں سفارش کی گئی ہے کہ ہندوستانی فوج کو برطانوی حکومت کے ماتحت نہیں بلکہ حکومت ہند کے ماتحت ہونا چاہئے۔ اس وقت حکومت ہند کے تین ارکان یہاں موجود ہیں جن کی جلد کا رنگ میرا جیسا ہے بلکہ بعض کا مجھ سے زیادہ سیاہ ہے۔ ان میں سے دو زمانہ طالب علمی میں انگلستان میں میرے ہر وقت کے ساتھی تھے اور تیسرے بھی اسی زمانہ میں تعلیم حاصل رہے تھے۔ اگر یہ لوگ فوج کا انتظام کر سکتے ہیں تو مسٹر تیج بہادر سپرو ہندوستان کے وزیر اعظم کیوں نہیں ہو سکتے۔

یا سر محمد شفیع اور مسٹر محمد علی جناح ہندوستان کے وزیراعظم کیوں نہیں ہو سکتے اور کیوں نہیں ہندوستانی فوج کی نگرانی کر سکتے۔ اور مجھ جیسا حقیر آدمی یا میرے دیو قامت بھائی ہندوستان کے کمانڈر انچیف کیوں نہیں ہو سکتے۔

میں نے ضرور اپنی تقریر سے آپ صاحبان کو تھکا دیا ہوگا مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس قدر لمبی تقریر کرتے ہوئے میں خود بھی بہت تھک گیا ہوں۔ اب میں ختم کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ جناب صدر کانفرنس کے عام اجلاس میں مجھے اس وقت تک دوبارہ تقریر کرنے کے لیے نہ کہیں گے جب تک کہ وہ یہ اعلان نہ کریں کہ ہندوستان اسی طرح آزاد ہے جس طرح کہ انگلستان۔